# فیض کی عملی سیاست__ایک مطالعہ

خاور نوازش*

**Abstract:**

Faiz Ahmad Faiz was not only a distinct poet of Urdu and an influential left wing intellectual but a political activist too. He can be considered in the pioneers of Progressive Writers Association that has been taken as the wing of communist writers since its early period. He was an avowed Marxist-communist who even joined British Indian Army to record its resistance against Fascism that was dreaming to rule over Soviet Union. Faiz Ahmad Faiz had also been working for trade unions since his stay in Amartsar. His affiliation with Sajjad Zaheer and somehow with Communist party of Pakistan dragged him in Rawalpindi Conspiracy Case and remained in prison for more than four years. Faiz received Lenin Peace Prize by the Soviet Union in 1962 that was a great and only achievement by any Pakistani poet and left wing political activist. This article is all about his political career.

فیض احمد فیض (۱۹۱۰ء۔۱۹۸۴ء) اُردو کی ادبی روایت کا اتنا بڑا نام ہیں کہ اُن کی تخلیقی شخصیت کے متنوع پہلوؤں پر بات تمام ہونے کا شائبہ بھی نہیں گزر سکتا۔ ممکن ہے فیض کے محققین و ناقدین کو یہ بات ناگوار گزرے لیکن سچ یہی ہے کہ اُن میں سے بیشتر 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' سے ہی ابھی تک نہیں نکل سکے یا اسی قبیل کی

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

چند دوسری معروف نظمیں جو فیضؔ کے بارے میں اُن کے قائم کردہ مفروضات کو درست ثابت کرنے میں ممد و معاون رہیں۔ یہاں فیضؔ کی فکر کے حوالے سے کسی استدلال کو غلط ثابت کرنا مقصود نہیں کیونکہ ہمارا موضوع اُن کی عملی زندگی سے متعلق ہے، سو فقط اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ فیضؔ پر غالبؔ اور اقبالؔ کے اثرات تلاش کرنے یا ثابت کرنے کے بجائے اُن کی شاعری کے اُس منفرد فکری نظام کو سمجھنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے پس منظر میں سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔فیض کے اس مربوط فکری نظام کی بدولت انھیں جو ادبی مقام حاصل ہوا اُس نے فیضؔ کی اُن عملی سرگرمیوں پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کا جواز بسا اوقات پیدا کیا جن کی نوعیت خالصتاً سیاسی ہے لیکن ہمیشہ ان سرگرمیوں کا ایک سرسری بیان ہی زیرِ بحث آتا رہا۔فیضؔ کے کسی شعر یا نظم کے حوالے سے کیا یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ اس کا پس منظر 'قیدِ تنہائی' ہے یا یہ کہ فلاں شعر اُن کے پسندیدہ موضوع انقلاب پر مبنی ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا کیونکہ قیدِ تنہائی اور انقلاب وغیرہ فیضؔ کی عملی زندگی کے ایک طرح سے مختلف ادوار ہیں جن سے بحث کیے بغیر فکری گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

فیضؔ کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز تو انجمن ترقی پسند مصنفّین میں شرکت اور تنظیمی سرگرمیوں میں شمولیت سے ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کے بیشتر واقعات اور مجموعی فضا نے بھی اُن کے اندر سیاسی شعور کی بیداری اور پختگی میں اہم کردار ادا کیا۔ فیضؔ بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوئے تو اُس زمانے میں تحریکِ آزادیٔ ہند زور پکڑ رہی تھی۔فیضؔ کا امرتسر جلیانوالہ باغ کے خونچکاں سانحے سے گزر چکا تھا۔تحریک خلافت اور ترکِ موالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا جتنا مضبوط اتحاد دیکھنے میں آیا تھا وہ مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ انقلابِ روس کی چہ میگوئیاں فیضؔ کے گھر کے دیوان خانے میں بھی ہونے لگیں تھیں اور یہ ہندوستان کے مزدور طبقے کے لیے اُمید کا پیغام تھا۔ یہ تمام باتیں اُن کے لاشعور کا حصہ بن رہی تھیں۔ یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ کر نصابی کتب کے علاوہ جس غیر نصابی مواد کی طرف فیضؔ راغب ہوئے اُس کا بیشتر حصہ روس کے کلاسیکی ادب پر مشتمل تھا۔اُن کے لاشعور میں موجود انقلاب کی موہوم سی جھلک نے ہی اُس ملک کے کلاسیکی ادب سے دلچسپی پیدا کی جہاں اقتدار پر مزدوروں نے قبضہ کر کے اجارہ داروں سے اپنے حقوق چھین لیے تھے۔۱۹۳۵ء میں فیض نے ایم اے او کالج، امرتسر سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تو انھیں وہاں محمود الظفر (۱۹۰۳ء۔۱۹۵۶ء) ایسے رفیقِ کار میسر آئے جو انقلاب کا ابتدائی دور دیکھ چکے تھے اور انھوں نے اپنے تاثرات اور مطالعہ میں فیضؔ کو بھی شریک کیا۔محمود الظفر کی شریکِ حیات ڈاکٹر رشید جہاں (۱۹۰۵ء۔۱۹۵۲ء) بھی اُن دنوں وہیں ہوتی تھیں،جنھوں نے فیضؔ کی نیتِ شوق بھانپتے ہوئے کمیونسٹ مینی فیسٹو اُن

کے ہاتھ میں ایسے تھمایا کہ پھر آخر وقت تک وہی فیضؔ کا محبوب رہا۔سوشلزم اور مارکسزم کا مختصر عرصے میں ہی فیضؔ نے اتنا مطالعہ کرلیا کہ اُن کا سیاسی شعور پختہ ہوکر اپنے معاشرے میں روسی طرز کے انقلاب کی خواہش کو جنم دینے لگا۔

اُس زمانے میں لندن میں مقیم کچھ روشن خیال ہندوستانی طلباء نے فاشزم کے خلاف یورپی ادباء کے ردِ عمل سے اثرات قبول کرنے کے بعد ہندوستانی لکھاریوں کی ایک ایسی تنظیم بنانے کا سوچا جس کے پلیٹ سے عالمی عصری منظرنامے پر برصغیر کی نمائندگی کی جا سکے۔چنانچہ ان طلباء نے سجاد ظہیر (۱۹۰۵ء-۱۹۷۳ء) کی رہنمائی میں 'انڈین پروگریسو رائیٹرز ایسوسی ایشن' کی بنیاد رکھی' لندن میں اس کا منشور لکھا گیا اور انہی خطوط پر ہندوستانی ادیبوں کی ایک تنظیم برصغیر میں قائم کرنے کی تجویز کے ساتھ اس منشور کی نقل محمود الظفر کو بھیجی گئی۔فیضؔ اس بابت یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ:

> ''سیاست میں تو ہم نے فوج میں جانے سے پہلے ہی حصہ لینا شروع کر دیا تھا.....محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم کی جائے۔کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور کام کریں گے۔''(۱)
>
> ''اُس دور میں دانشوروں کی منظّم تحریک موجود نہ تھی۔عالمی سطح پر اسپین میں فرانکو کے خلاف دنیا بھر کے لکھنے والوں نے مزاحمتی علم بلند کیا ہوا تھا اور یہاں ہم غلام تھے......اس نوعیت کی عالمی حالت میں خوش آئند اور اُمید افزا بات سوشلسٹ روس کی ریاست کا وجود تھا۔روس نے تمام دنیا کے نوجوانوں کے ذہنوں پر انقلابی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اور گہرا اثر کیا تھا۔بھئی دنیا کا بیشتر حصہ اس وقت سامراجیوں کے چنگل میں تھا۔لہٰذا اپنے ہاں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا معرضِ وجود میں آنا وقت کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔''(۲)

انجمن ترقی پسند مصنّفین کا ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ قیام عمل میں آیا تو فیضؔ انجمن کے بانی رُکن ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب شاخ کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔پنجاب کا مرکز چونکہ لاہور تھا اس لیے ہفتہ وار اجلاس کے لیے فیضؔ امرتسر سے لاہور جایا کرتے تھے۔۱۹۳۷ء میں فیضؔ کی کوششوں سے جلیانوالہ باغ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک تاریخی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس سے اس تحریک کو خاصی توانائی ملی (۳) انجمن میں شامل بیشتر لوگ مارکسی فکر کے حامل تھے اور چونکہ خود فیضؔ نے بھی اس کے قیام کا پس منظر انقلابِ روس کے اثرات قرار دیا ہے سو کچھ ہی عرصہ بعد ادیبوں کی اس انجمن کو کمیونسٹوں کا محاذ قرار دیا جانا ایک فطری امر دکھائی دیتا ہے۔بہرکیف اس اقدام سے

ملازمت پیشہ ادیبوں کے لیے کھلے عام انجمن کی سرگرمیوں میں شامل ہونا ممکن نہ رہا لیکن فیضؔ ان حالات میں بھی انجمن کے لیے متواتر سرگرمِ عمل رہے۔ ۱۹۳۹ء میں جن دنوں فیضؔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہے تھے، دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ فاشزم یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تو نازی ازم نے ہندوستان کا رُخ کرنا شروع کر دیا۔ برصغیر کے لوگوں کے پاس ایسے میں دو بہت واضح راستے تھے، ایک تو یہ کہ انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے جاپانیوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا جائے لیکن یہ ایک طاقت سے پیچھا چھڑا کر خود کو دوسرے سامراج کے سپرد کرنے والی بات تھی اور دوسرا یہ کہ انگریزوں کا فاشزم کے خلاف لڑنے میں ساتھ دیا جائے، فیضؔ اور اُن کی قبیل کے دوسرے دانشوروں نے موخرالذکر کو فوقیت دی۔ کہتے ہیں کہ:

''جرمنی نے اپنی ابتدائی فتوحات سے بدمست ہو کر روس پر حملہ کر دیا۔ روس اس وقت تمام دنیا کے مزدوروں کی جنگِ آزادی کا علمبردار تھا...... ہم جو عالمی مزدور تحریکوں کے باہم اشتراکِ عمل کے قائل رہے ہیں یہ کیسے دیکھ سکتے تھے کہ فسطائی اندھی طاقت دنیا کی پہلی مزدور ریاست کو تاراج کر دے۔ ہم نے فاشزم کے خلاف آواز بلند کی۔''(۴)

یوں ہندوستانی فوج میں فیضؔ کی شمولیت ایک سیاسی حکمتِ عملی کے تحت دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُن کی فوجی خدمات دراصل سیاسی خدمات تھیں جن کا مقصد انگریز سامراج کا ساتھ دینا نہیں بلکہ فاشزم کی مخالفت تھا۔ اس مقصد میں دراصل انقلابِ روس کی رومانویت اور ایک مزدور ریاست کے سحر کو بڑا دخل تھا۔ ہندوستانی فوجیوں کو عالمی جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے پر راضی کرنے کے لیے اُن کی ذہنی تربیت بھی ضروری تھی اور فیضؔ کی فوج میں شمولیت کے بعد پہلی دفعہ یہ نکتہ انگریز حکام کے سامنے رکھا گیا۔ فیضؔ ۱۹۴۲ء میں اپنے دوست مجید ملک کی تحریک پر بطور کپتان برٹش انڈین آرمی کے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں شامل ہوئے۔ اس محکمے میں اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

''میرے ذمے ایک تو مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے لیے پبلک ریلیشنز یا اطلاعات بہم پہنچانے کا کام تھا یعنی فوجی اخبارات اور رسائل وغیرہ کی اشاعت، ریڈیو پر فوجی پروگرام وغیرہ وغیرہ اور کچھ برٹش انڈین آرمی کی ہائی کمان کو سیاسی مشورہ دینا۔''(۵)

فوجی ملازمت کے عرصے میں فیضؔ اپنے ترقی پسند دوستوں اور کمیونسٹ رہنماؤں سے بھی مسلسل رابطے میں رہے بلکہ دہلی میں اُن کے ہاں کمیونسٹوں کے کچھ رسمی و غیر رسمی اجلاس بھی منعقد ہوئے لیکن یہ بات حکامِ بالا کے علم میں آنے کے بعد فیضؔ نے اپنے گھر پر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بند کر دیا تھا۔ فیضؔ کے فوج میں شمولیت کے فیصلہ پر

اسرار الحق مجاز (۱۹۰۹ء-۱۹۵۵ء) اور احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۶ء) ایسے رفقائے کار نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کچھ ناقدین نے اسے ہوسِ زر سے تعبیر کرنے کی کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ:

''فیضؔ کی فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان مجبور ہوتا ہے' جنگ نے حالات خراب کر دیے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے' جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ زیست دشوار ہے' یونیورسٹی اور کالج کی ملازمت میں کیا ملتا ہے۔'' (۶)

فیضؔ ایسے سوشلسٹ کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ انھوں نے بہتر معاشی مواقع دیکھ کر فوج میں شمولیت اختیار کی، کسی بھی طرح درست نہیں کیونکہ انھوں نے اپنی شمولیت کے تناظر میں کارفرما فکر کو کئی جگہوں پر واضح کیا جو خالصتاً سیاسی مصلحت پر مبنی ہے۔ فیضؔ ایک نظریاتی آدمی تھے اور اگر معاش کا معاملہ اُن کے نزدیک اس قدر اہم ہوتا تو جن دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین پر کمیونسٹ لیبل لگا اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (۱۸۹۹ء-۱۹۷۸ء) اپنی سرکاری ملازمت کے پیشِ نظر انجمن کی سیکرٹری شپ چھوڑ گئے، فیضؔ بھی اُس وقت ایم اے او کالج سے منسلک تھے لیکن انھوں نے سرکاری ملازمت کی پروا کیے بغیر ترقی پسندوں کی سرگرمیوں میں باقاعدہ شرکت جاری رکھی۔ اور دوسری بات یہ کہ جب برطانیہ اور امریکہ نے مل کر سوشلسٹ ریاست کے خلاف سازشیں شروع کیں تو فیضؔ کا میدانِ عمل تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے ان سازشوں کا پردہ فاش کرنے کے لیے انگریزی فوج سے علیحدگی اختیار کر لی اور پچیس سو روپے ماہانہ کی ملازمت چھوڑ کر ایک ہزار روپے ماہانہ پر 'پاکستان ٹائمز' میں آ گئے۔ فیضؔ کے بارے میں ایسی قیافہ شناسائیاں اور بھی بہت سے ناقدین کی طرف سے وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اُن کی قربت میں ایک عرصے گزارنے والوں اور فیضؔ کے مزاج سے بخوبی واقف اصحاب کا بھی یہی رویہ رہا۔

فیضؔ کی عملی سیاست کا ایک اور پہلو ٹریڈ یونین تھی۔ ٹریڈ یونین سے دلچسپی فوج میں شمولیت سے قبل امرتسر میں ہی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جب انھوں نے ٹیکسٹائل ورکرز یونین کے ایک عہدیدار بشیر احمد بختیار کی رہنمائی میں امرتسر کے اُس صنعتی علاقے کا رُخ کیا جو 'چھ ہرٹا' کہلاتا تھا اور یہاں بیشتر مزدور سکھ تھے' مسلمانوں کے محلے کا نام اسلام آباد تھا جہاں وہ کھڈیاں چلاتے اور گھریلو دست کاری کا کام کرتے تھے (۷) فیضؔ نے ان مزدوروں کی بنیادی تربیت کی طرف توجہ دی اور اُنھیں مزدوروں کے حقوق اور عالمی مزدور تحریکوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ مزدوروں کی ذہنی سطح پر آ کر تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی علوم کی تدریس کا کام بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔ م۔ش سے

ایک گفتگو میں فیضؔ بتاتے ہیں کہ:

''میں نے امرتسر کے صنعتی علاقے میں کام شروع کیا اور مزدوروں کے مسائل میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ان دنوں میں امرتسر لیبر فیڈ ریشن کا رُکن تھا۔ اس فیڈ ریشن کا آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس سے الحاق تھا۔''(۸)

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس اُس وقت برصغیر کی سب سے نمایاں مزدور تنظیم تھی اور فیضؔ براہِ راست اس کی سرگرمیوں میں بھی شریک رہے۔ یوسف بلوچ لکھتے ہیں کہ:

''آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس سرفہرست تھی جس کی بنیاد کمیونسٹوں اور اس وقت کے قوم پرستوں نے رکھی ان فریڈم فائیٹرز میں فیض احمد فیضؔ، سیف الدین کچلو، لالہ لاجپت رائے، مرزا محمد ابراہیم، سنتوش کمار، مہندرہ جیسے لوگ شامل تھے۔''(۸)

جن دنوں فیضؔ ہیلے کالج لاہور آئے وہاں رمیش چندر چارلی تانگہ یونین چلاتے تھے' چارلی کے توسط سے اُن کی ملاقات ٹریڈ یونین کے دوسرے لیڈروں سے ہوئی اور باہمی تعاون سے دو سال تک ٹریڈ یونین میں وہ تنظیمی خدمات انجام دیتے رہے(۹) اس کے بعد فیضؔ برٹش انڈین آرمی میں شامل ہو گئے اور پھر ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں شریک نہ رہ سکے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہاں ایک نئی تنظیم 'پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن' کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے عہدے داروں میں مرزا محمد ابراہیم (صدر)، محمد افضل (سینئر نائب صدر)، فیض احمد فیضؔ (نائب صدر) اور ایم اے مالک (جنرل سیکرٹری) شامل تھے۔ اسی دور میں ریلوے ورکرز یونین میں انھوں نے اپنی صحافتی مصروفیات کے باوجود خصوصی دلچسپی لی۔ یوسف بلوچ لکھتے ہیں کہ:

''فیض احمد فیضؔ ریلوے ورکرز یونین کے دفتر یوگنڈا ہاؤس گڑھی شاہو میں باقاعدگی سے آکر بیٹھتے اور محنت کشوں کو ملنے والی انتظامیہ کی طرف سے چارج شیٹ یا شوکاز نوٹس کا جواب دیتے۔ فیض احمد فیضؔ خود اسے انگریزی میں لکھتے اور پھر اپنے ہاتھ سے رائیٹر پر ٹائپ کر دیتے۔''(۱۰)

علاوہ ازیں فیضؔ نے پوسٹل ورکرز اور لوئر گریڈ اسٹاف یونینز بھی تشکیل دیں اور انھیں ملکی سطح پر منظّم کیا۔ وہ اس یونین کے صدر جبکہ مولوی گل چیں نائب صدر رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے آئی ایل او (انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن) کے زیرِ اہتمام سان فرانسسکو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فیضؔ نے پاکستان کی مزدور کمیونٹی کی نمائندگی کی۔ اسی طرح کی دوسری کانفرنس جنیوا میں ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی تو اُس میں

بھی فیضؔ شریک ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں ’کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان‘ کا قیام عمل میں آیا۔فیضؔ کے بارے میں اُن کے تمام ناقدین اورخود انھوں نے بھی کئی جگہوں پر یہ واضح کیا ہے کہ وہ اس پارٹی کے ساتھ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں کبھی بھی منسلک نہ رہے۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ کمیونسٹ پارٹی میں اُن کی باقاعدہ رُکنیت کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن اس پارٹی کے ساتھ اُن کی نظریاتی وابستگی سے کسی طور بھی انکار ممکن نہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس پارٹی کی تنظیم سازی کے لیے دوستوں کو مشورے دینے کے ساتھ ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے رہے۔قیامِ پاکستان کے بعد اس پارٹی سے اُن کی وابستگی کا ایک ثبوت عابد حسن منٹو کے ان الفاظ سے ملتا ہے کہ:

”قیامِ پاکستان کے بعد جب کمیونسٹ پارٹی کو از سرِ نو منظّم کیا گیا تو ان دنوں ہر رکن کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی ماس فرنٹ پر بھی کام کرے۔فیضؔ صاحب نے ٹریڈ یونین کا انتخاب کیا۔ان کا ٹریڈ یونین میں جانا اس بات کی دلیل تھا کہ دانشوروں،ادیبوں اور مزدوروں کا کاز ایک ہی ہے۔“(۱۱)

فیضؔ ٹریڈ یونین کے ساتھ منسلک تھے اور اس ادارے کی باقاعدہ رُکنیت کے حامل تھے اور درج بالا اقتباس سے اشارہ ملتا ہے کہ مذکورہ ادارے میں رہتے ہوئے اُن کا ’کاز‘ وہی تھا جو کمیونسٹ پارٹی کا تھا۔ عابد حسن منٹو مزید واضح کرتے ہیں کہ:

”مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ وہ باقاعدہ پارٹی کے کسی سیل کے ممبر تھے یا نہیں البتہ انھوں نے ہمیشہ پارٹی ڈسپلن کو مانا۔“(۱۲)

فیضؔ کمیونسٹ پارٹی کے کسی سیل کے ممبر خواہ نہیں تھے لیکن یہ طے ہے کہ وہ پارٹی کے لیے متحرک ضرور رہے اور ٹریڈ یونین میں رہتے ہوئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جو سرگرمیاں انجام دیں وہ کمیونسٹ پارٹی کے منشور کا بنیادی حصہ تھیں۔سو ایسے میں اس بات کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے کہ وہ پارٹی کی ممبر شپ رکھتے تھے یا نہیں‘ گویا ۱۹۵۱ء میں پنڈی سازش کے الزام میں دھر لیے جانے کے اسباب میں برٹش انڈین آرمی میں سابقہ خدمات اور حکمرانوں کے اُن سے ذاتی عناد کے علاوہ فیض کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی بھی شامل ہے۔ پنڈی سازش کیس کے حوالے سے ایک عرصہ تک منظر نامہ واضح نہ ہو سکا تھا کیونکہ اس سازش میں ملوث مجرموں پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک خصوصی ٹربیونل کے قیام کا جو ایکٹ ۱۶؍اپریل ۱۹۵۱ء کو منظور کیا اُس میں کیس کی کارروائی کو مکمل طور پر خفیہ رکھنے کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا‘ وکیل تک کو کوئی بات افشا کرنے پر دو سال کی سزا تجویز کر دی گئی۔(۱۳) پنڈی سازش کا پس منظر دراصل پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ تھی جو کشمیر کے محاذ پر ۲۱؍اکتوبر ۱۹۴۷ء سے

۳۱/دسمبر ۱۹۴۸ء تک جاری رہی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے اعلیٰ فوجی افسران کو اعتماد میں لیے بغیر اقوامِ متحدہ کے ایما پر بھارت کے ساتھ فائر بندی کا اعلان کر دیا جس پر فوج کا ردِعمل بہت شدید تھا۔ میجر جنرل اکبر خان نے' جو پنڈی سازش کا بنیادی کردار تھے اسے حکومت وقت کا نہایت غلط فیصلہ قرار دیا۔ فوجی افسران حکومتی پالیسیوں سے متنفر ہونے کے بعد ۱۹۴۹ء میں حکومت گرانے کے بارے میں سوچنا شروع کر چکے تھے۔ پنڈی سازش میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان ۱۹۵۰ء میں ملوث ہوئی اور اس میں بنیادی کردار اکبر خان کی بیوی نسیم اکبر خان کا تھا جو کمیونسٹ پارٹی کے لیے مختلف حوالوں سے سرگرمِ عمل تھیں۔ حسن ظہیر لکھتے ہیں کہ:

''اکبر خان پر سب سے قوی اور فیصلہ کن اثر ان کی بیوی کا تھا جن کے عزائم بھی اونچے تھے اور وہ نظریاتی اعتبار سے بھی متحرک تھیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے چندہ جمع کرتی تھیں اور خود بھی پچاس روپے ماہانہ دیتی تھیں......مسز اکبر خان کی بہن ممتاز جمال کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھیں۔ انہوں نے اکبر خان پر دباؤ ڈالا کہ اپنی سازش میں شریک ساتھیوں کو عملی کمیونسٹ بنائیں......کمیونسٹ پارٹی کے سلسلے میں اکبر خان کا رویہ نظریاتی سے زیادہ عملی تھا۔ وہ اپنے تختہ اُلٹانے کے منصوبوں میں سیاسی حمایت چاہتے تھے اور وہ انھوں نے کمیونسٹوں سے حاصل کر لی۔''(۱۴)

فیضؔ اس سازش کا حصہ یقیناً کمیونسٹ پارٹی کے توسط سے ہی بنے۔ فیضؔ اور اکبر خان کے مراسم کافی پرانے تھے۔ فیضؔ اکثر اُن کے ہاں قیام کرتے تھے۔ دونوں اصحاب ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے بھی مدح تھے۔ فیضؔ سے ایک ملاقات میں جب اکبر خان نے اُنھیں حکومت گرانے کے منصوبے کے بارے میں بتایا تو اُنھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو اس معاملے میں فیصلہ ساز قوت قرار دیا۔ جب معاملہ پارٹی کی مرکزی قیادت کے سامنے رکھا گیا جس میں سجاد ظہیر، سبطِ حسن، سی آر اسلم، محمد افضل اور شوکت علی وغیرہ شامل تھے تو اُن میں سے کچھ نے پارٹی کو اس میں شامل نہ ہونے کا مشورہ دیا لیکن سجاد ظہیر اس حوالے سے مزید غور کرنا چاہتے تھے اور فیضؔ بھی اُن کے ہم خیال تھے۔ فیضؔ اس سازش کا حصہ کیونکر بنے اور وہ کس حد تک اس ٹیم میں سرگرم تھے، اس موضوع پر خود فیضؔ نے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی نہ ہی اعتراف یا دفاع میں ہلکے پھلکے بیانات کے علاوہ کھل کر کچھ کہا۔ ممکن ہے اس کی بڑی وجہ لفظ 'سازش' ہو جس کی جگہ 'انقلاب' کا لفظ نہ لے سکا۔ بہر کیف اگر فیض یہ کہتے ہیں کہ:

قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں ؎

شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں (۱۵)

تو اس سے نہ صرف 'قصہ ٔ سازشِ اغیار' میں دلچسپی کا عنصر پیدا ہوتا ہے بلکہ 'شکوۂ یارِ طرحدار' میں بھی تجسس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ بہر کیف اکبر خان اور اُن کے ساتھیوں نے منصوبے کی تاریخ اور وقت طے کر لیا تھا لیکن حبیب اللہ، صدیق راجہ، یوسف سیٹھی اور ظفر اللہ پوشنی' جن میں سے کچھ تو پہلے ہی ایوب خان اور حکومتی حلقوں سے مل گئے اور بقیہ بعد میں وعدہ معاف گواہ بن گئے' کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا اور حکومت کے خلاف ایک بڑی سازش قرار دے کر اس میں شامل تمام فوجی افسران اور سویلین گرفتار کر لیے گئے جن میں فیضؔ بھی شامل تھے۔ یہاں ضروری ہے کہ اس منصوبے کے بارے میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیضؔ کے بیانات بھی واضح ہو جائیں۔ فتح محمد ملک نے خلیق انجم کے سجاد ظہیر سے ایک انٹرویو کو مآخذ بناتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اکبر خان کے گھر ہونے والے اجلاس میں بغاوت کی پوری اسکیم پر گفتگو ہوئی اور بعض افسروں نے مشورہ دیا کہ ابھی بغاوت مناسب نہیں ہے' صورتِ حال کا جائزہ لے کر سجاد ظہیر نے مشورہ دیا کہ ابھی بغاوت نہ کیجیے' اکبر خان نے یہ مشورہ مان لیا اور معاملہ تقریباً ختم ہو گیا۔(۱۶) اس بیان میں 'ابھی' کا لفظ بہر کیف معنی خیز معلوم ہوتا ہے گویا انھیں اسکیم سے اختلاف نہیں تھا بلکہ اس کے اطلاق کا وقت مناسب نہ ہونے پر اصرار تھا۔ فیضؔ اس حوالے سے کہتے ہیں کہ:

> ''قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں' چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور نہ یہاں آئین بنا تھا' نہ سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طریقے سے منظّم ہوا تھا۔ ملک کے بحری، بری اور ہوائی افواج کے سربراہ لیاقت علی خان تھے۔ کشمیر کا قصہ بھی تھا...... چونکہ ان دوستوں سے میرے ذاتی مراسم تھے' اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے خود ہی ساری منصوبہ بندی کی اور ہم سے کہا' ہماری بات سنئے' ہم نے ان کی بات سن لی۔ پھر انھوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہیے...... ہماری میٹنگ میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے اور کسی نے اوپر جا کر مخبری کر دی کہ ہم لوگوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا منصوبہ بنایا ہے۔''(۱۷)

سجاد ظہیر اور فیضؔ کے بیانات سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بہر صورت حکومت کے خلاف ایک سازش تیار ہو رہی تھی یا ہو گئی تھی اور اُس میں مذکورہ دونوں اصحاب شریک بھی رہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس سازش کی جڑیں دراصل فوج کے اندر موجود تھیں۔ بہر کیف فیضؔ ۹ /مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار ہوئے۔ خصوصی ٹربیونل میں مقدمے کی سماعت ۱۵/جون کو شروع ہوئی جبکہ ۵/جنوری ۱۹۵۳ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا جس کے تحت فیضؔ کو چار سال قید با مشقت اور پانسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ فیصلے کے وقت تک وہ قریباً دو برس قید کاٹ چکے تھے۔

ابتدائی تین ماہ انھوں نے سرگودھا اور فیصل آباد کی جیلوں میں قیدِ تنہائی میں گزارے بعدازاں حیدرآباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں انھیں، میجر اسحاق محمد اور کیپٹن خضر حیات کی معیت میں منٹگمری جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں مولوی تمیزالدین کیس (۱۸) کے فیصلے کے بعد پنڈی سازش کے ملزمان نے لاہور ہائی کورٹ میں اپنی حراست کے غیر قانونی ہونے کی درخواست دائر کر دی۔ جس پر بالآخر اُن کی رہائی کے احکامات جاری ہو گئے لیکن پوری طرح رہائی سے قبل ہی ۱۹۴۴ء کے نظر بندی آرڈیننس کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۲/اپریل ۱۹۵۵ء کو لاہور ہائی کورٹ نے مذکورہ آرڈیننس کے تحت پنڈی سازش کے قیدیوں کی گرفتاری بے بنیاد قرار دیتے ہوئے رہائی کا حکم دے دیا۔ پنڈی سازش کی اس پوری کہانی کے حقائق کیا تھے، اس پر تحقیق تو ظاہر ہے دستاویزات کی روشنی میں ہی ممکن تھی اور حسن ظہیر جو ایک ریٹائرڈ بیورکریٹ ہیں نے بیشتر ایسی دستاویزات سے ہی حوالے دیے ہیں جو ان کے مفروضے کو درست ثابت کر سکیں یہاں تک کہ حسین سہروردی کے اس سازش کے ملزمان کی صفائی میں پیش کیے گئے دلائل کا کہیں کوئی ذکر موجود نہیں۔ پنڈی سازش کے محرکات کو سمجھنے اور اس پورے منظرنامے کے بے لاگ تجزیے کے لیے بہرصورت یہ تمام پہلو ملحوظ رکھنا ضروری ہوں گے۔

رہائی کے بعد فیضؔ نے 'پاکستان ٹائمز' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی صحافتی زندگی کا دوبارہ آغاز کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں وہ ایفرایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے تاشقند گئے۔ فیضؔ سوویت یونین کے دورے پر ہی تھے کہ پاکستان میں کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان آمد پر انھیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے پہلے لاہور جیل میں لے جایا گیا اور پھر شاہی قلعہ منتقل کر دیا گیا جہاں سے وہ اپریل ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد انھیں 'پاکستان ٹائمز' کی ادارت سنبھالنے کی پیش کش ہوئی لیکن اسے رد کر دیا۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں سوویت یونین کی طرف سے امنِ عالم کے فروغ کے لیے خدمات کے اعزاز میں شہرۂ آفاق 'لینن امن انعام' سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں ماسکو میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فیضؔ نے کہا کہ:

> ''سامراج اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنھیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان اور بعض افریقی حکومتوں میں بھی موجود ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان

اختلافات کے منصفانہ حل پر غور وفکر اور اس کے حل میں امداد دینا بھی لازم ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔''(۱۹)

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ کی طرف سے ایٹم بم کے استعمال کے بعد سوویت یونین کی اپیل پر ہر ملک میں امن کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا تا کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں کا سدِ باب کرنے کے ساتھ ساتھ مستقل امن کے قیام پر زور دیا جائے۔فیضؔ پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔امنِ عالم کے لیے اُن کی کوششوں کے بارے میں سبطِ حسن لکھتے ہیں کہ:

''فیض صاحبؔ نے افسر شاہی کے عتاب کی پرواہ نہ کی۔وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور لاہور، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، لائل پور، غرض کہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا، اس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں سے نہ صرف دنیا کا امن اور نو آزاد ملکوں کی آزادی ہی خطرے میں ہے بلکہ پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے بھی عالمی امن کتنا ضروری ہے۔''(۲۰)

اس کے بعد فیضؔ کی تصنیفی سرگرمیاں تو جاری رہیں لیکن سیاست سے عملی طور پر وہ کنارہ کش ہو گئے۔ ایوب خان تو اُن کے 'لینن امن انعام' پانے کے لیے ماسکو جانے کے پر بھی ناخوش تھے لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے انھیں تعاون حاصل رہا۔'لیل و نہار' میں ملک کی عصری سیاسی و معاشرتی فضا پر کافی عرصہ اداریے بھی لکھے اور پھر ضیاالحق دور میں 'لوٹس' کے مدیر ہو کر طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔فیضؔ کی شعری عظمت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں داخلی اور خارجی کیفیات کو غنائی لہجے کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا جبکہ عملی زندگی میں فیضؔ انقلابی نظریہ کے داعی کے طور پر سرگرمِ عمل رہے۔سوشلزم کے ساتھ اُن کی کمٹ منٹ آخر تک برقرار رہی' سوویت یونین اور مزدوروں کی حکومت کی رومانویت نے انھیں اپنے ملک میں بھی ایک ایسے ہی نظام کی ترویج کے لیے ہمیشہ اُکسائے رکھا اور جس حد تک ممکن تھا وہ اس کے لیے عملی طور پر بھی اقدامات کرتے رہے۔ انقلاب کی اسی خواہش نے انھیں ٹریڈ یونین کے لیے متحرک کیا اور اسی سوچ کے تحت انھوں نے سرکش فوجی افسران کے ساتھ بیٹھنے میں بھی پس و پیش نہ کیا جس کے نتیجے میں طویل عرصہ قید و بند کی صوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔فیضؔ بلاشبہ اُس تحریک کا نام ہیں جو پاکستان کا ادبی و ثقافتی حوالہ ہونے کے ساتھ ساتھ استحصالی طبقے کی سیاسی وفکری ترجمان ہے۔

# حوالہ جات وحواشی


۱۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے ( مرتبہ)، اکتوبر۱۹۹۲ء، لاہور، جنگ پبلشرز، ص ۱۴۱-۲

۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، جنوری ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ص ۱۱۹۔۱۲۱

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۴۔ ایضاً، ص ۵۵۔۵۶

۵۔ ایضاً، ص ۵۷

۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، چند یادیں' چند تاثرات، مشمولہ: افکار فیض نمبر، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۳

۷۔ عبداللہ ملک، لاؤ تو قتل نامہ مرا، جنوری ۱۹۸۵ء، لاہور، کوثر پبلشرز، ص ۱۱۶

۸۔ م۔ش، فیض کی کہانی' اُن کی اپنی زبانی، مشمولہ: باتیں فیض سے (مرتبہ: شیما مجید)، جون ۱۹۹۳ء، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ص ۳۲

۹۔ یوسف بلوچ، ٹریڈ یونین اور فیض، مشمولہ: ہفت روزہ' مزدور جدوجہد فیض نمبر، لاہور، جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۶، ۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۹

۱۰۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا، ص ۱۱۷

۱۱۔ ٹریڈ یونین اور فیض، ص ۳۹

۱۲۔ عابد حسین منٹو، ۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء، انٹرویو (فاروق سلہریا، ناصر اقبال)، ہفت روزہ' مزدور جدوجہد فیض نمبر، لاہور، جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۶، ص ۳۰

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ فتح محمد ملک، فیض: شاعری اور سیاست، ۲۰۰۸ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۴۴

۱۵۔ حسن ظہیر، راولپنڈی سازش ۱۹۵۱ء: پاکستان میں فوجی انقلاب کی پہلی کوشش (مترجم: سہیل انجم)، ۲۰۰۲ء، کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ص ۲۲۳

۱۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، فروری ۱۹۸۴ء، لاہور، مکتبہ کارواں، ص ۴۵

۱۷۔ طاہر مسعود، راولپنڈی سازش کیس پر ایک گفتگو، مشمولہ: باتیں فیض سے، ص ۲۵۸، ۲۵۹

۱۸۔ ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کر دی۔ محمد علی بوگرہ نئے وزیرِ اعظم منتخب ہوئے۔ تحلیل شدہ اسمبلی کے صدر مولوی تمیزالدین نے وفاق کے خلاف درخواست دائر کر دی۔ جس پر فیڈرل کورٹ نے یہ فیصلہ سنایا کہ دستور ساز اسمبلی کی قانون سازی میں گورنر جنرل کی منظوری ضروری ہے خواہ وہ دستور ادارے کے طور پر سرگرم ہو یا وفاقی مقنّنہ کی حیثیت سے۔ اس فیصلے کے بعد قانونی نقطہ نظر سے راولپنڈی سازش خصوصی ٹربیونل بھی باطل قرار پایا کیونکہ یہ بھی انہیں قوانین کی بنیاد پر تشکیل پایا تھا جن میں گورنر کی منظوری ضروری نہیں تھی۔

۱۹۔ فیض احمد فیض، فیض کی ایک یادگار تقریر، مشمولہ: ماہِ نو، بیادِ فیضؔ، لاہور، مئی جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۵

۲۰۔ سبطِ حسن، سخن در سخن، ۱۹۸۷ء، کراچی، دانیال، ص ۷۸

❁ ❁ ❁